معاصر اردو ناول میں عصریت

غفور احمد
پی ایچ ڈی سکالر (اردو)
پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

CONTEMPORARINESS IN MODERN URDU NOVEL

Ghafoor Ahmad
PhD Scholar (Urdu)
Punjab University Oriental College, Lahore

Abstract

Literature of every era is reflective of particular time. So is the case of Urdu literature. Like other literary genres, Urdu novel is an index of contemporariness. The Urdu novel written in 21st century and especially after the 9/11 depicts the very situation of both local and international scenarios. A number of novels have been written in the backdrop of the terror attack on the twin tower of America. Consequently, the transpiration of international stage which played havoc with the already poor and backward nations has been a valid topic for novel writing across the globe including Urdu. This article focuses the contemporainess in modern Urdu novel.

Keywords:
اردو، ناول، مستنصر حسین تارڑ، بانو قدسیہ، لاہور، فیصل آباد

ہر دور میں تخلیق ہونے والا اَدب اپنے معاصر عہد کو کہیں نہ کہیں آشکار کر دیتا ہے۔نظم وغزل میں علامتی اور استعاراتی انداز اپنایا جاتا ہے تو افسانوی ادب میں مختلف کرداروں کی زبانی کچھ واقعات زیرِ قلم آجاتے ہیں۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ یہ واقعات یا سانحات افسانوی ادب کی متعلقہ صنف میں کہانی کو متاثر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ناول میں اس کے اثرات افسانے کی نسبت بہت زیادہ نہیں ہوتے، اس کی وجہ شاید یہ ہوتی ہے کہ ناول کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے اور اس طرح کے ضمنی واقعات ناول کے ماجرے میں سما جاتے ہیں۔لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ کچھ مدت گزر جانے کے بعد، انھی تاریخی سانحات کو بنیاد بنا کر بڑے اور خوب صورت ناول لکھے گئے۔ڈاکٹر شاہد نواز کے خیال میں ناول اور تاریخ کا تعلق بہت گہرا ہے۔ناول تاریخ کو جزوی طور پر اپنے اندر سمیٹ کر تاریخ کو کہانی کی شکل عطا کرتا ہے تو یہی تاریخ ناول کو بنیادی مواد اور مآخذ بھی فراہم کرتی ہے۔(۱) دنیا بھر کے ادب میں اس کی وافر مثالیں موجود ہیں۔اس بات کو اگر یوں بیان کریں تو غلط نہ ہوگا کہ عالمی ادب کے بڑے بڑے ناولوں میں سے اکثریت کا تعلق کسی نہ کسی عصری یا ماضی قریب کی کہانی سے براہ راست جُڑا ہوا ہے۔اگر اکیسویں صدی کے اُردو ناول کا جائزہ لیں تو بہت سارے ایسے واقعات ہیں جو ہمیں مختلف ناول نگاروں کے ہاں دکھائی دیتے ہیں۔اُسلوب، ہئیت اور اثر پذیری میں ایک نمایاں فرق ہے لیکن پیش کش میں ان کی تکرار یہ ظاہر کر رہی ہے کہ ان واقعات و سانحات نے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا ہے بلکہ ناول کی تخلیقی دنیا کے منظر نامے پر بھی اُبھرے ہیں۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۰ء کو امریکہ میں جُڑواں عمارتوں کا انہدام یکے بعد دیگرے ہونے والے ایسے واقعات ہیں جنھوں نے پورے عالمی منظر نامے کو متاثر کیا۔ایک بڑی طاقت ہونے کے ناطے ایک زعم لے کر امریکہ نے افغانستان پر چڑھائی کر دی۔اس کے نتیجے میں جو احساس باشعور انسانوں میں پیدا ہوا وہ ایک فطری ردِعمل تھا۔اکیسویں صدی کے ادیب نے اس استحصال کو شدت سے محسوس کیا ہے، اگر اس کا ذہن قومی اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہے، اگر وہ نسلِ انسانی کے دکھ کا ادراک رکھتا ہے اور اگر اس کی سوچ نسلی، لسانی اور جغرافیائی اختلافات سے بلند ہے تو اس کے ہاں یہ کسک کسی نہ کسی صورت ملتی ہے۔(۲) پاکستانی اُردو ناول میں اس واقعے کے نتیجے میں پیدا شدہ صورت حال کو بہت خوب صورتی سے سمویا گیا ہے۔

۲۰۰۲ء میں شائع ہونے والا ''قلعہ جنگی'' مستنصر حسین تارڑ کا ایک مختصر سا ناول ہے جو افغانستان کی جنگ کوموضوع بناتا ہے۔اس جنگ کا دائرہ کار روس، طالبان، شمالی اتحاداورامریکہ تک وسیع ہے۔بنیادی طور پر یہ ان مجاہدین کی اذیت ناک موت کی داستان ہے جوڈیزی کٹر بم کے حملے میں زندہ بچ گئے تھے۔افغانستان پچھلی کئی دہایوں سے حالتِ جنگ میں ہے۔۱۱ستمبر کے حملوں کی مبینہ منصوبہ بندی کا الزام اوراس کے نتیجے میں ہونے والے امریکی حملے سے اس خطے کو عالمی شہرت (یا بدنامی)حاصل ہوئی۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے بقول ''اس کے سروکاروں میں مذہبی جنگ، اس کے نتائج خاص طور پر سماج کی بوتل میں سے جنگ کے جن کے باہر آجانے کے بعد اسے پھر سے بوتل میں واپسی میں ناکامی اور بری موت کا بھگتنا شامل ہے۔''(۳)مذکورہ ناول میں بھی انھی عصری سانحات کوموضوع بنایا گیا ہے:

> ''سکول کے باہر۔۔کوئی بھی لاش ہوسکتی تھی ۔۔بالکل اپنی یا سراسر پرائی ۔۔۔ہاں یہ کہ اگر وہ بچہ شمال کا ہے تو پہلے روسی اسے لاشیں مہیا کردیتے تھے، پھر طالبان نے یہ ذمہ داری سنبھال لی اوران دنوں پتہ نہیں کون اس فرض کوانجام دے رہا تھا۔۔لاشوں کی سپلائی میں رخنہ نہیں پڑ رہا تھا۔۔اوراگر وہ ایک بچہ پشتون ہےتو ان دنوں شمال والے ان کے قبرستان بھر رہے تھے۔۔چناں چہ ایک افغان بچے کے لیے ۔۔زندگی تو بن سکتی ہے موت حیرت کا موجب نہیں بن سکتی۔''(۴)

اردوادب میں بانوقدسیہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔اب تک ان کے متعدد ناول شائع ہو چکے ہیں۔۲۰۰۳ء میں ان کا ناول ''حاصل گھاٹ'' ہمارے سامنے آتا ہے جس کا بنیادی موضوع مشرقی اورمغربی تہذیب کی آویزش ہے۔روبینہ سلطان کے مطابق ''بانوقدسیہ نے دوتہذیبوں کے تصادم کواجاگر کرنے کی بجائے ان تہذیبوں کے منفی پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔''(۵)اس تہذیبی تصادم کے ساتھ ساتھ مختلف کرداروں کی زبانی کچھ اسی قسم کے مکالمات ملتے ہیں جواس امر کی عکاسی کرتے ہیں کہ وہ عصر حاضر کی صورت حال کا نہ صرف پورا ادراک رکھتی ہے بلکہ اس جبر اور استحصال کی کسک بھی محسوس کر رہی ہے:

> ''میں ۱۱ستمبر سے پہلے لبرل تھا بابا جان ۔۔۔کیوں کہ میں کسی خیال، مسلک، مذہب، ملک، خاندان سے وابستہ نہیں تھا۔نہ میری جڑیں کہیں تھیں' نہ میرا دماغ کہیں تھا۔۔۔جو آدمی کہیں بندھا ہو وہ آسانی سے لبرل نہیں ہوسکتا.....گیارہ ستمبر کے بعد پتہ نہیں کیوں

میں نے نوکری چھوڑ دی ـــ اور تاریخ پڑھنا شروع کر دی ـــ میں بش کے ایکشن کا جواز ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ ـــ میں نے ظلم کی تاریخ کو بہت مقامات پر سٹڈی کیا ـــ کشمیر ـــ بوسنیا' چیچنیا' جلیانوالاباغ' ہلاکو' نادرشاہ' چنگیز خان ـــ کھال کھنچوانے کے واقعات، پنجروں میں بند قیدی ـــ ہٹلر ـــ ہیروشیما۔ اتنے سارے مظالم جو انسان پر ہو گزرے ہیں۔ انھوں نے مجھے اور لبرل کر دیا ہے۔''(٦)

نکہت حسن کا ناول ''جاگنگ پارک'' ٢٠١٠ء میں منظر عام پر آیا۔ ہئیت اور موضوع کی جدت کی بنا پر یہ ایک منفرد ناول ہے۔ یہاں مصنفہ دورِجدید کے انسان کی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کی گرہ کشائی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حالیہ برسوں میں ہونے والی بے پناہ مادی ترقی اور اخلاق واقدار کی شکست وریخت نے زندگی کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ گلوبل ویلج کی اصطلاح نے دنیا کو مزید سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اب عالمی حالات وواقعات کی خبروں تک رسائی زیادہ سہل ہو گئی ہے۔ چناں چہ اس ناول کا ایک صحافی کردار جب ناول کے مرکزی کردار 'زبیدہ' سے یہ پوچھتا ہے کہ وہ ٹوئن ٹاور کے حادثے کا سن کر روئی تھی تو وہ جس قسم کا طنزیہ جواب دیتی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

''ٹوئن ٹاور تو اب گرے ہیں بیٹا جی، میں تو ١٩٤٥ء کا واقعہ تاریخ میں پڑھ کر رو رہی ہوں۔ جب ١٦ اگست ١٩٤٥ء کی صبح کو سوا آٹھ بجے ہیروشیما کی ہنستی بستی، بستی پر حقوقِ انسانی کے دعویداروں نے سب سے پہلا ایٹم بم گرا کر دو لاکھ معصوموں کا قتل کیا تھا۔ اور بربریت کا نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا...... اور اس کے بعد سال ڈیڑھ سال کے وقفے سے دنیا کے مختلف ممالک پر کچھ اسی قسم کے حملے ہو رہے ہیں۔ کون سا ایسا ملک ہے جو ان حملوں سے محفوظ ہے۔ کیا چین، کیا کوریا، گواٹے مالا، انڈونیشیا، کیوبا، کانگو، ویتنام، کمبوڈیا، لیبیا، پناما، عراق، سوڈان، فلسطین، بوسینا ہرزوگووینا اور اب افغانستان۔ رونے کے لیے تو پوری زندگی بھی ناکافی ہے اور میری مقدرت اتنی نہیں کہ کسی نوحہ گر کو ہی ساتھ رکھ سکوں۔''(٧)

بھرپور مادی ترقی اور مشینی سہولیات نے انسان کی جسمانی سرگرمیوں کو محدود کر دیا ہے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ سہل پسند اور آرام طلب ہو گیا ہے۔ من پسند غذاؤں کی عام دستیابی اور بسیار خوری جیسی عادات نے صحت مند زندگی کو گہنا دیا ہے۔ ڈاکٹروں کی تنبیہ کے بعد مختلف پارکوں میں مردوزن کی ایک

بڑی تعداد چکر لگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔''جاگنگ پارک'' کے علامتی لیکن اصلی پارک میں بھی ایسی ہی خلق خدا صحت کی بحالی کے لیے آتی ہے لیکن ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا کے دُکھ اور محرومیاں ساتھ لے جاتی ہے۔ایسے ہی ایک چکر میں جب یہی خاتون پارک میں کام کرنے والے مالی کو بتاتی ہے کہ تمھاری بیوی مرجائے گی وہ اتنے بچوں کی متحمل نہیں ہوسکتی تو وہ افلاطونی قسم کا جواب دیتا ہے:

''کوئی نہیں مرتی۔سب بے فضول باتیں ہیں۔ہر جی اپنا رزق اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔تم لوگوں کا کیا ہے۔تمھارے بچے تو نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔پیدا ہوتے ہی ان کو امریکہ بھیج دیتے ہو۔وہاں سے کوئی طالبان بن کر آتا ہے تو کوئی اسامہ اور کوئی ملا عمر۔ گولیاں تو ہمارے ہی بچے کھاتے ہیں۔ہم بچے پیدا نہیں کریں گے تو گولیاں کھانے کے لیے بچے کہاں سے آئیں گے؟''(۸)

اسی سال شایع ہونے والا ایک اہم ناول مستنصر حسین تارڑ کا''خس و خاشاک زمانے'' ہے۔ ماضی میں تارڑ کی پہچان ان کی سفر نامہ نگاری رہی ہے لیکن یہ طے ہے کہ مستقبل میں ان کی ادبی زندگی کا سب سے مضبوط حوالہ ان کی ناول نگاری ہی ہوگی۔اکیسویں صدی کے پہلے بارہ سالوں میں ان کے یکے بعد دیگرے پانچ ناول جہاں ان کی زود نویسی کا ثبوت ہیں وہاں اس بات کے بھی شاہد ہیں کہ ان کی تحریروں میں تنوع کا ایک جہان آباد ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اُن کے بڑھاپے کی بے پایاں فراغت،تخلیقیت میں ڈھل گئی ہے اور ان کی صراحی سے قطرہ قطرہ''ناول'' ٹپک رہے ہیں۔ایک حساس ادیب کی طرح آمریت سے نفرت اور مطلق العنانیت کی حوصلہ شکنی ان کی تحریروں میں جا بجا ملتی ہے۔ ۱۱ستمبر کے بعد کی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے وہ''خس و خاشاک زمانے'' میں لکھتے ہیں:

''نصف شب کی قربت میں جب ایک کمانڈو جنرل جس کی جرأت اور شجاعت کا کچھ حساب نہ تھا ہڑبڑا کر بستر سے اُٹھتا ہے۔۔اور فون اٹھا کر اپنے شب خوابی کے لباس کے پاجامے کا ازار بند تھامتا اُٹھتا ہے تو اٹینشن ہو جاتا ہے۔۔یس سر۔۔یا تو آپ ہمارے ساتھ ہیں یا نہیں ہیں۔۔اگر نہیں ہیں تو۔۔۔ووئی ول بومب یُو ٹو سٹون ایج۔۔ہم آپ کے ساتھ ہیں سَر۔۔۔'' (۹)

اسی ناول میں ایک کردار کی زبانی افغانستان پر امریکی حملے کی جلد بازی کو بیان کیا گیا ہے جو اس بات کا اظہار ہے کہ عظمت انسان کسی ادیب کے ہاں کس قدر راہم ہے۔وہ محبت اور امن و آشتی کا

پیامبر ہوتا ہے۔اس طرح کے فیصلوں کو ایک ادیب اپنے ایک کردار کی آنکھ سے کس طرح سے دیکھتا ہے:

''انصاف کے حصول میں دیر سویر ہو سکتی ہے لیکن انتقام لینے میں اگر ذرا سی دیر ہو جائے تو مشتعل شدہ جذبات اور عزت نفس کی دُکھن میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔۔اس لیے ذرا سی بھی دیر نہ کی گئی۔بابل کے میناروں کے انہدام کے پورے اٹھائیس روز بعد اُس ایک ملک پر۔۔جو پہلے سے تباہ حال اور برباد تھا۔۔مقدس امریکی جہاد کے ثمرات تلے جھکا جاتا تھا یہاں تک کے اُس کا ہر بڑا شہر کھنڈر ہو چکا تھا۔''(۱۰)

۲۰۱۲ء میں شائع ہونے والے وحید احمد کے ناول کا ایک بڑا موضوع عصر حاضر میں ہونے والی دہشت گردی ہے۔اس دہشت گردی کی سب سے بھیانہ صورت خودکش حملے ہیں۔جنگوں میں اور دشمن پر فدائی حملے ہمیشہ سے ایک کارگر تکنیک رہے ہیں۔دھماکہ خیز مواد کی فراہمی اور تکنیکی ترقی نے اس سے ہونے والی تباہی و بربادی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اتحادی بنا اور ردعمل میں خودکش دھماکے ہونا شروع ہو گئے۔ملک دشمن عناصر نے بھی اس حربے سے فائدہ اٹھایا اور مذہبی ولسانی منافرت کے پردے میں معصوم لوگوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔عوامی اجتماعات، مساجد، سکول اور غیر فوجی ادارے اس کا آسان ہدف ٹھہرے۔مذکورہ بالا ناول میں ایک ایسے ہی حملے کے بارے میں لکھے گئے یہ جملے کتنی خوف ناک صورت حال کی عکاسی کر رہے ہیں:

''اچانک جلسے کے وسط میں ایک انسانی بم پھٹا۔دھوئیں اور شعاعوں کا بادل اُبھرا۔ گوشت نے شکلیں بدلیں۔جلسے کا قلب قصاب کی دُکان تھی۔قیمہ، بڑی اور چھوٹی بوٹیاں، ہڈیوں کے ٹکڑے، خون کے دھبے، کٹی ہوئی کھوپڑیوں سے جھانکتی بے نیاز آنکھیں، انتڑیاں، جگر پر پتے کی ہریالی، بکھری ہوئی انگلیاں اور سمٹے ہوئے دل تھے جن کے اوپر لوگ صورِ اسرافیل کی بانگ سُنی کی سراسیمگی کے عالم میں بھاگ رہے تھے۔اس اندھا دھند بھاگ دوڑ سے جو لوگ روندے جا رہے تھے ان میں اس خودکش کا سر بھی تھا۔'' (۱۱)

اکیسویں صدی کی اُردو ناول نگاری میں محمد عاصم بٹ ایک اہم نام ہے۔ان کا پہلا ناول ''دائرہ'' ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آیا اس کے بعد ''نا تمام'' شائع ہوا۔حال ہی میں شائع ہونے والا ان کا ناول ''بھید'' ایک مختلف تکنیک کا حامل ہے۔اس ناول میں بھی عصری سانحات کا ذکر ملتا ہے۔دہشت

گردی کے نام پر امریکہ کی مختلف ممالک میں مداخلت ان دوعشروں کا اہم موضوع ہے۔اس مداخلت نے معتوب کرداروں کے ذہنوں میں ایک نفرت کو جنم دیا ہے۔استعمار کے خلاف یہ نفرت بالواسطہ یا بلا واسطہ کہیں نہ کہیں ظاہر ہو جاتی ہے۔ایک اقتباس دیکھیے:

''امریکیوں نے کیا ات مچائی ہوئی ہے،باؤ صاب۔جاسوس بھی بھیج دیئے۔ہمارے جیسے ملک سے اس کا کیا مطلب۔کچھ نقطہ سمجھاؤ۔اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا .....پہلے جرمنوں نے مت ماری،پھر برطانیہ نے،اب امریکی،یہ چٹے ہمارے ہی ویری کیوں ہیں؟باقی دنیا کو نہیں چھیڑتے۔انڈیا تو سکھ چین سے ہے۔وہاں کیوں نہیں جاتا امریکہ۔ہمیں ہی آ آ کر اُنگل دیتا ہے۔کھوتے دا پُتر۔''(۱۲)

دیگر جان داروں کی طرح ابن آدم کو بھی زندہ رہنے کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ زمانہ ماضی میں انسان یہ ضرورتیں انفرادی طور پر پوری کر لیتا تھا لیکن گزرتے ہوئے زمانے کے ساتھ بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں نے خوراک کے حصول کو ایک اجتماعی ذمہ داری بنا دیا۔خوراک کی پیداوار اور ترسیل، روزگار کا ایک منافع بخش وسیلہ ٹھہری تو معیار و مقدار کے سانچے بدل گئے اور ملاوٹ عام ہونے لگی۔ اشیائے خورونوش میں ملاوٹ،پوری دنیا میں ایک قبیح فعل سمجھا جاتا ہے۔سائنسی پیش رفت نے اس ملاوٹ کا سراغ لگانا سہل بنا دیا ہے۔اسی ترقی کی بنا پر مہذب دنیا نے بڑی حد تک اس سے تو چھٹکارا پا لیا ہے لیکن مصنوعی طور پر تیار کردہ کھانے پینے والی اشیا نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ان صورتوں کا ذکر اب افسانوی ادب میں بھی ہونے لگا ہے:''بھید'' کا ایک کردار اسی اذیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

''اس چائے میں تو بال صفا پاؤڈر ڈالتے ہیں سفید سفوف کی صورت،دودھ کی جگہ۔اسے بیچنے والے بھی اسے دودھ نہیں کہتے،ٹی وائٹنر لکھتے ہیں،کبھی غور سے ریپر دیکھو۔صاف لکھا ہے نرا کیمکل،اور چائے کی پتی وتی بھی کچھ نہیں ہوتی۔پینٹ والا رنگ ڈالا ہوتا ہے،تبھی تو ادھر پانی میں ڈالو،ادھر رنگ نکل آتا ہے۔اتنی جلدی رنگ چھوڑنے والی پتی کبھی سنی ہے۔''(۱۳)

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں جمہوری روایات مستحکم نہ ہو سکیں۔اب کچھ عرصے سے وطن عزیز میں انتخابات کا بُرا بھلا سلسلہ جاری ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس عرصہ میں پروان چڑھنے والے جمہوری سیاسی رویوں نے آزادی اظہار کے نام پر ایک وسیع کینوس فراہم کر دیا ہے۔سیاست کی وہ پُر خار وادی،جس کی

منظر کشی صرف مدبرین سیاست ہی کیا کرتے تھے، آج روزمرہ زندگی کا سب سے عام موضوع ہے۔اسی عمومیت کی بنا پر سیاست کا ذکر اب افسانوی ادب میں بھی بڑی کثرت سے ملتا ہے۔پاکستان میں ان حالیہ سالوں میں ہونے والے دھرنوں نے جہاں عوامی سطح پر شعور کو بہتر بنایا وہاں ان سے جڑے ہوئے شکوک وشبہات اور سازشیں بھی بے نقاب ہوئیں۔کسی دھرنے کے حامی یا مخالف کا تناظر، سیاسی حوالے سے مختلف ہوتا ہے اس لیے وہ ان دھرنوں کی توجیہات پر تبصرہ بھی اپنے انداز سے کرتا ہے۔زیرِ نظر ناول میں ایسی ہی ایک مثال دیکھیے:

> ''ہم حکومت کے خلاف ہونے والے دھرنوں پر من پسند دھواں دار بحث میں مصروف تھے۔ہمارا ایک دوست ان دھرنوں کے سخت حق میں تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ اسٹیبلشمنٹ کا کیا دھرا تھا یعنی اسٹیبلشمنٹ دھرنا دینے والوں کی پشت پناہی کر رہی تھی۔وہ اسٹیبلشمنٹ کے بھی سخت خلاف تھا۔اس کے باوجود وہ دھرنہ دینے والوں کا حامی تھا۔جو بظاہر اس کے خلاف نعرے لگا رہے تھے لیکن اندر سے اس سے جڑے ہوئے تھے۔عجیب گھمن گھیری تھی۔ایک الجھاؤنی صورت حال۔''(۱۴)

مذہبی ولسانی اختلافات اور رنگ ونسل کے جھگڑے بنی نوع انسان میں نئے نہیں ہیں لیکن ذرائع مواصلات کی ترقی سے اب ایسے واقعات کی خبریں پل بھر میں پھیل جاتی ہیں۔پوری دنیا میں ہونے والے ایسے دل خراش واقعات نے انسانیت کا احترام کرنے والے دلوں کو رنجیدہ کیا۔بدقسمتی سے حالیہ سالوں میں پاکستان میں بھی کچھ ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے جن میں نومبر ۲۰۱۴ء میں ضلع قصور کی تحصیل کوٹ رادھا کشن کے ایک نواحی گاؤں میں ایک مسیحی جوڑے کو زندہ جلا دیا گیا۔اپریل ۲۰۱۷ء میں خیبر پختون خواہ کی ایک جامعہ میں ایک نوجوان طالب علم مشال خان کو قتل کر دیا گیا۔اسی طرح ہزارہ برادری کا قتل عام بھی ایک ایسا ہی قابلِ مذمت واقعہ تھا۔مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ پاکستان میں خاص طور پر کوئٹہ میں اگر آپ گورے چٹے ایک منگول ناک والے ہزارہ قبیلے سے ہیں تو یوں جانیے آپ نشانہ پر ہیں، آپ کی موت طے ہو چکی ہے اور اگر آج نہیں تو کل آپ ہلاک کر دیے جائیں گے۔(۱۵)۲۰۱۸ء میں شائع ہونے والا مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''منطق الطیر، جدید'' ایک منفرد اُسلوب اور منفرد موضوع کا احاطہ کرتا ہے لیکن ان حالیہ واقعات کی بازگشت اس ناول میں بھی سنائی دیتی ہے۔

"اور کہیں نہ کہیں کوئی عیسائی جوڑا، کوئی غیر مسلم، کوئی حافظ قران، کوئی منگول ناک والے ہزارے بچے یا کوئی مشال حسین اُس کی زد میں آ کر یوں بُھس کی مانند کچلا جاتا ہے جیسے ابرہہ کی فوج ابابیلوں کے کنکروں سے بُھس کی مانند ہو گئی تھی ..... انکار اور اقرار کا جب تک قضیہ طے نہ ہو تب تک یہ پہلا پتھر ہمیشہ --پتھر کا ایک پرندہ اُڑان میں رہے گا۔"(۱۶)

متذکرہ بالا چند مثالیں مشت نمونہ از خروارے ہیں ورنہ عصر حاضر کے ادب میں ان سانحات وواقعات کی تکرار بڑی نمایاں ہے۔ظاہر ہے ایک ادیب بھی دیگر انسانوں کی طرح اسی عالمِ آب وگل کا پروردہ اور اسی دشت کا سیاح ہوتا ہے ۔ وہ اپنی زندگی میں ہر لحہ ان فضاؤں میں محو پرواز رہتا ہے جہاں بدقسمتی سے کرگس اور شاہین کے جہان کی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔دوسرے یہ کہ ادیب معاشرے میں سب سے زیادہ حساس ہوتا ہے ۔اس کے مشاہدے میں گہرائی اور گیرائی بھی زیادہ ہوتی ہے تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ عصر حاضر کی انسانی زندگی سے جُوے ہوئے حادثات اس کی تحریروں سے عیاں نہ ہوں۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) شاہد نواز، ڈاکٹر۔پاکستانی اُردو ناول میں عصری تاریخ ۔سرگودھا: شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۸ء، ص ۲۲

(۱) غفور احمد۔نئی صدی۔نئے ناول ۔لاہور: دارالنوادر، ص ۱۴۷

(۲) ممتاز احمد خان، ڈاکٹر۔اُردو ناول کے ہمہ گیر سروکار۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ص ۱۸۶

(۳) مستنصر حسین تارڑ۔قلعہ جنگی ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۴

(۴) روبینہ سلطان ۔تین نئے ناول نگار ۔لاہور: دستاویز، ۲۰۱۲ء، ص ۶۵

(۵) بانو قدسیہ۔حاصل گھاٹ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۲۸۷، ۲۸۸

(۶) نگہت حسن ۔جاگنگ پارک ۔کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۰ء، ص ۳۹، ۴۰

(۷) ایضاً، ص ۵۳

(۸) مستنصر حسین تارڑ۔خس و خاشاک زمانے۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء،ص ۵۱۰

(۹) ایضاً،ص ۵۰۹

(۱۰) وحید احمد۔مُندری والا۔فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۲ء،ص ۱۶۶

(۱۱) محمد عاصم بٹ۔بھید۔لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء،ص ۹۴

(۱۲) ایضاً،ص ۱۰۴

(۱۳) ایضاً،ص ۱۸۱

(۱۵) مستنصر حسین تارڑ۔ہزار داستان ہزاروں کے قتل کی۔کالم، روزنامہ ۹۲، ۱۲ نومبر، ۲۰۱۷ء

(۱۶) مستنصر حسین تارڑ۔منطق الطیر جدید۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء،ص ۴۳

✿✿✿